الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۱، جنوری۔ جون۲۰۱۲ء

مولانا عبدالعلیم ندوی مرحوم

(ایک شاگرد کی یادوں میں)

محمد راشد شیخ

زندگی کے مختلف مراحل میں ہر انسان کا واسطہ مختلف مزاج، عمر اور رتبے کے انسانوں سے ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض انسانوں کی یادیں تلخ اور بعض کی شیریں ہوتی ہیں۔ ان شیریں یادوں والے بزرگوں میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں جنھیں وقت گزرنے کے ساتھ ہم بھلا دیتے ہیں جبکہ بعض بزرگ اور محبت کرنے والی شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ خواہ کتنے ہی ماہ و سال گزر جائیں، ان کی یادیں حافظے کی لوح سے محو نہیں ہو پاتیں بلکہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان کی یادوں کے نقوش مزید گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ آج میں ایسے ہی ایک محترم استاد کی یادوں کے چراغ روشن کر رہا ہوں جن سے آج سے تقریباً ۳۵ برس قبل رابطہ ہوا، دو سال تک ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور جن کی یادیں اور باتیں بھلانا تو رہا ایک طرف رہا، ان کی شخصیت اور یادوں کے نقوش وقت گزرنے کے ساتھ مزید گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ تھے ہمارے استادِ محترم مولانا عبدالعلیم ندوی مرحوم جن سے تعلق اور تلمذ کی کہانی اور ان کے مختصر حالاتِ زندگی ہم بیان کریں گے۔ مولانا سے اولین تعلق اس وقت قائم ہوا جب راقم علامہ اقبال ہائی اسکول لطیف آباد نمبر۹ (حیدرآباد) میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس اسکول کی عمارت نہایت سادہ، اکثریت غریب طلبہ پر مشتمل لیکن پڑھائی اور نظم و ضبط مثالی تھا۔ اسکول میں ہیڈ ماسٹر سید مشتاق علی صاحب تھے، جو دیانت داری، نظم و ضبط، فرض شناسی اور تعمیر سیرت و کردار کی بنا پر پورے حیدرآباد میں مشہور تھے اور اب بھی ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ تا دیر انھیں صحت و عافیت کے ساتھ رکھے۔

مشتاق صاحب کی پوری کوشش ہوتی کہ اسکول میں بہترین اساتذہ جمع کیے جائیں جو نہ صرف طالب علموں میں حصول علم کی سچی لگن پیدا کریں بلکہ ان کی کردار سازی بھی کریں۔ ان کی اسی کوشش کے نتیجے میں مولانا عبدالعلیم ندوی صاحب نے زیل پاک اسکول سے علامہ اقبال ہائی اسکول آنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔

یادش بخیر، یہ ۱۹۷۸ء کے موسم سرما کی ایک سہانی صبح تھی۔ ہمیں پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ ایک مولانا ہمیں پڑھانے آرہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں بھی ان کا وہی روایتی مولویوں والا تصور تھا جس کی تفصیلات سے عموماً لوگ واقف ہیں۔ دوسرے ہی دن مولانا عبدالعلیم ندوی صاحب تشریف لائے لیکن نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ عام مولوی حضرات اور ان مولانا صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ سردیوں کے دن تھے مولانا کو دیکھا تو ایک جاذب نظر شخصیت بالکل صاف اور نفیس کتھئی رنگ کی شیروانی اور سفید رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس نظر آئی۔ نکلتا ہوا قد، کسرتی بدن نہ موٹاپے کی طرف مائل اور نہ ہی دبلا، مونچھیں صفائی سے کتری ہوئی، داڑھی سفید اور نہایت خوبصورتی سے شرعی حدود کے اندر ترشی ہوئی، بال پٹے دار جن میں سفید زیادہ اور سیاہ کم، سر پر صاف ستھری جناح کیپ، پاؤں میں صاف ستھرے جوتے معلوم ہوتا ابھی ابھی پالش کیا ہے۔ ہونٹ پتلے اور خوبصورت، آنکھوں پر ہلکے نیلے رنگ کا خوبصورت چشمہ جس میں سے دو ذہین اور روشن آنکھیں ہر وقت حرکت کرتی نظر آتیں۔ راقم کو پہلی نظر میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا کی صفائی پسندی اور سر سے پیر تک ہر چیز سے نفاست پسندی کا مظاہرہ تھی۔ یہ تو خیر سردیوں کے دن تھے گرمیوں میں بھی مولانا کا لباس عموماً یا تو سفید کڑھا ہوا ململ کا کرتا اور علی گڑھ کٹ پاجاما یا ہلکے نیلے رنگ کا خوبصورت شلوار قمیص ہوتا۔ پاؤں میں حسب معمول عمدہ پالش کیے ہوئے جوتے اور سر پر دوپلی ٹوپی ہوتی جو عموماً ندوی حضرات سر پر پہنتے ہیں اور جیسی مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم بھی ہمیشہ پہنتے تھے۔ یہ تو تھا مولانا سے متعلق پہلا تاثر اور سچ تو یہ ہے کہ پہلی ہی نظر میں مولانا نے نفاست پسندی کا جو تاثر قائم کیا، اس کا اثر آج تک ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ راقم کلاس کا مانیٹر تھا اس لیے پوری کلاس میں مولانا سے سب سے زیادہ تعلق میرا ہی رہا اور اسی تعلق پر کچھ مشتمل یادیں اس مضمون میں پیش کی جارہی ہیں۔

چند روز بعد ہی مشتاق علی صاحب نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کے

لیے مولانا صبح کی دعا (جس میں تلاوت قرآن کے بعد علامہ اقبال کی مشہور نظم 'بچے کی دعا' تمام طلبہ کورس کی شکل میں پڑھتے تھے) کے متعلق مختصر خطاب فرمایا کریں چنانچہ مولانا کے خطاب کا آغاز ہوا۔ اس خطاب کے دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے مولانا کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کی عادت کا پہلی مرتبہ مظاہرہ ہوا اور بعد کے دو برسوں میں تقریباً ہر روز ہوتا رہا۔ مولانا کوئی نہ کوئی دلچسپ فقرہ یا کوئی دلچسپ بات اس انداز سے کرتے جس سے حاضرین و سامعین میں ہنسی اور مسرت کے شگوفے کھل اٹھتے۔ ہوا یہ کہ دوران تقریر مولانا نے ایک شعر پڑھا جس پر بعض طلبہ نے (جن کی سمجھ میں نہ تو تقریر آرہی تھی اور نہ ہی شعر آیا بلکہ جو تقریر سے اکتاہٹ اور بوریت محسوس کررہے تھے) داد دینے کے انداز میں بار بار واہ واہ کہنا شروع کیا۔ مولانا اس حرکت کو سمجھ گئے اور ان شریر طلبہ کو ایسا مسکت جواب دیا کہ آئندہ کبھی ان کو ایسی حرکت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہاری اس واہ واہ پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک مرتبہ ایک شاعر کو غزل سنانے کے لیے کافی تلاش کے باوجود کوئی سامع نہ ملا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ سامنے ایک گدھا کھڑا ہے۔ شاعر نے سوچا کیوں نہ گدھے کو ہی غزل سنا دوں چنانچہ پوری غزل سنا دی۔ غزل سننے کے بعد گدھے نے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکالنی شروع کردی۔ اس پر وہ شاعر بہت مسرور ہوا اور سمجھا کہ گدھے نے غزل پر داد دی ہے مگر درحقیقت گدھا غزل کے ایک شعر تو کیا ایک مصرع کو بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ تم بھی بالکل اس گدھے کی طرح واہ واہ کرتے ہو جبکہ شعر سمجھے بغیر شعر پر داد دینا بجائے خود ایک احمقانہ حرکت ہے۔ مولانا یہ الفاظ غصے سے نہیں بلکہ دلچسپ انداز میں ادا کیے جس پر تمام حاضرین ہنسنے لگے اور شریر طلبہ کی سبکی ہوئی۔ بعد کے دو برسوں کے دوران معلوم ہوا کہ یہ مولانا کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے کہ ہر محفل میں کوئی نہ کوئی دلچسپ بات ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا کے وقار اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا خراماں خراماں کلاس کی جانب آتے تو طلبہ کے دل دھک دھک کرتے۔ اب اپنی یادوں کے ذخیرے سے مولانا سے متعلق چیدہ چیدہ واقعات تحریر کرتا ہوں جن سے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ایک مرتبہ اسکول میں امتحانات کے دوران ہماری کلاس میں مولانا موجود تھے۔ پرچہ سندھی زبان کا تھا جس کے استاد عاشق صاحب تھے۔ پرچے میں کوئی ایسی مشکل چیز تھی جس کے لیے عاشق صاحب سے معلومات درکار تھیں۔ ایک طالب علم نے مولانا سے گزارش کی کہ عاشق صاحب کو بلائیے۔

اب جیسے ہی مولانا نے 'عاشق' کا لفظ سنا تو ان کی رگِ ظرافت فوراً پھڑک اٹھی اور بلند آواز میں فرمایا ''عاشق صاحب جلدی آئیے یہاں آپ کے معشوق آپ کو یاد کررہے ہیں''۔ مولانا کے اس جملے پر نہ صرف کلاس کے تمام طلبہ بلکہ خود عاشق صاحب بھی کافی دیر تک مسکراتے رہے۔

ایک مرتبہ اساتذہ نے آپس میں رقم جمع کرکے دعوت کا پروگرام بنایا جس میں مولانا بھی شریک تھے۔ ایک صاحب کی ذمہ داری مرغی کاٹنے پر لگائی گئی۔ چھری کچھ زیادہ ہی تیز تھی چنانچہ مرغی کی پوری گردن کٹ گئی۔ اب مسئلہ یہ سامنے آیا کہ پوری گردن کٹی مرغی حلال ہے یا حرام چنانچہ اس بارے میں مولانا سے رجوع کیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ مشکوۃ شریف کی حدیث کے مطابق تو یہ مرغی حلال ہے لیکن اگرآپ لوگ اسے حرام سمجھ چکے ہیں تو اسے مجھے دے دیں، میں اسے حلال سمجھ کے پوری خود کھالوں گا۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

عموماً کلاس میں مولانا یوں تو تمام طلبہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتے اور سب سے یکساں سلوک کرتے، اگر سزا دینی ہوتی تو سب کو سزا دیتے اور تعریف کرنی ہوتی تو اس سے دریغ نہ کرتے لیکن پوری جماعت میں ایک طالب علم ایسا تھا جس کو مولانا نے کبھی سزا نہ دی بلکہ جب سزا پانے والے طلباء کھڑے ہوتے (باقی طلبہ بیٹھے رہتے) تو عموماً اس طالب علم کا نام بھی ان میں شامل ہوتا اور وہ بھی کھڑا ہوتا۔ اس موقع پر مولانا کے چہرے پر ایک خاص ہمدردانہ کیفیت نظر آتی اور اس طالب علم کا نام لے کر اسے بٹھا دیتے اور سزا سے بچالیتے۔ راقم الحروف طویل عرصے تک یہ سمجھتا رہا کہ یہ طالب علم جس کا نام محبوب تھا مولانا کا حقیقی بھتیجا ہے اور مولانا اس معاملے میں ڈنڈی مار کر اپنے بھتیجے کو ہمیشہ سزا سے بچالیتے ہیں۔ برسوں بعد مولانا کے برادر اصغر جناب مظفر لطیف صاحب کے ذریعے جب اصل حقیقت کا علم ہوا تو دل میں مولانا کی عظمت اور ان کا احترام اور بڑھ گیا۔ یہ طالب علم مولانا کے استادِ محترم حضرت مولانا حیدرحسن خاں ٹونکی (شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) کا حقیقی پوتا تھا۔ مولانا حیدر حسن خان کے صاحبزادے مولانا سعدحسن خان، پبلک اسکول حیدرآباد میں استاد تھے۔ محبوب ان ہی کا بیٹا تھا۔ اب پتہ چلا کہ مولانا عبدالعلیم ندوی کے دل میں اپنے استاد کا کس قدر احترام تھا جس کی بنا پر ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ استاد کے پوتے پر ہاتھ اٹھاتے۔ مولانا حیدرحسن خان صاحب کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب 'پرانے چراغ' اور رئیس احمد جعفری نے 'دید وشنید' میں بڑے

معلومات افزا مضامین لکھے ہیں۔

ایک مرتبہ کلاس میں مولانا تشریف لائے تو بعض طلبہ انگریزی زبان کا سبق Active passive کرنے میں مصروف تھے۔مولانا نے پوچھا کیا کررہے ہوتو انھوں نے یہی بتایا۔مولانا نے ڈانٹتے ہوئے کہا، بند کرو اس ایٹھو پیٹھو کو۔مولانا کے منہ سے Active passive کو ایٹھو پیٹھو سن کر بڑا لطف آیا۔

ایک مرتبہ مولانا نے گھر کے لیے کام دیا جسے ایک معروف طالب علم کسی وجہ سے نہ کرسکا۔ اگلے روز مولانا نے فرمایا جن لوگوں نے کام نہیں کیا وہ کھڑے ہوجائیں۔ ڈرتے ڈرتے وہ طالب علم بھی کھڑا ہوا۔مولانا نے پہلے تو غور سے اسے دیکھا پھر پرلطف انداز میں فرمایا ''بلبل پھنسی، مینا پھنسی، تو کیوں پھنسی ڈڈو'' اس پر کلاس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

بعض اوقات مولانا کلاس میں اپنے عہد شباب اور دور طالب علمی کے قصے بڑے پرلطف انداز میں بیان کرتے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجب طرح کی بے تکلفی تھی جس کی بنا پر طلبہ بھی مولانا سے ہر طرح کے سوالات کرتے۔ ایک مرتبہ ایسی ہی گفتگو کے دوران ایک طالب علم نے پوچھا ''کیا سیّد سلیمان ندوی آپ کے استاد تھے؟'' مولانا نے کڑک کر جواب دیا ''سیّد سلیمان ندوی ہمارے استاد تھے نہیں، ہمارے استاد ہیں''۔ استاد ہیں پر خوب زور دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ فرمایا کہ رزقِ حلال کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ دہلی میں مولانا کے ایک دوست تاجر تھے۔ انگریزی عہد میں حکومت نے اعلان کیا کہ مقررہ تاریخ تک جن لوگوں کے پاس ہزار کے نوٹ ہیں، وہ بینک سے بدلوا لیں کیونکہ ہزار کا نوٹ ختم ہونے والا تھا۔مولانا کے یہ دوست ایماندار تاجر تھے۔ کسی وجہ سے وہ ہزار کے چند نوٹ بدلوا نہ سکے اور مقررہ تاریخ گزر گئی۔ مولانا سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے اس نقصان پر ان سے افسوس کا اظہار کیا مگر ان تاجر دوست پر افسردگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ انہوں نے مولانا کہا کہ یہ رقم رزق حلال سے حاصل کی ہے، ان شاء اللہ ضائع نہ ہوگی۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہ رزق حلال کی برکت ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد انگریزی حکومت نے اعلان کیا کہ ہزار روپے والے نوٹ دوبارہ قابل استعمال ہیں۔ اس طرح ان دوست کی رقم ضائع ہونے سے بچ گئی۔

اس زمانے میں مولانا کی رہائش لطیف آباد نمبر ۱۰ میں محمدی مسجد کے بالکل نزدیک تھی۔

ہماری جماعت میں حیدر آباد کی معروف شخصیت میاں محمد شوکت کا بیٹا بھی تھا۔ ایک روز جب مولانا کو پتہ چلا کہ میاں شوکت صاحب کا بیٹا بھی زیر تعلیم ہے تو انھوں نے اس سے کہا کہ میاں صاحب کو میرا سلام کہنا۔ اس نے پوچھا میں آپ کے بارے میں کیا بتاؤں؟ مولانا نے کہا کہ ان سے صرف اتنا کہنا کہ دس نمبری مولانا نے سلام کہا ہے، وہ سمجھ جائیں گے۔

مولانا کے مزاج میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ خود داری بھی تھی۔ کلاس میں اپنی زندگی کے واقعات بڑے دلچسپ انداز سے بیان کرتے۔ مولانا کے ہر واقعے میں کوئی نہ کوئی اخلاقی تربیت کا پہلو ضرور ہوتا۔ ایک روز فرمانے لگے کہ ان کے ایک دوست آٹے کی بوری لے کر مولانا کے گھر آئے تاکہ مولانا کو پیش کریں۔ مولانا نے دروازے پر آکر ان سے پوچھا کہ یہ کیوں لائے ہیں؟ ان صاحب نے کہا: آپ کو پیش کرنے کے لیے۔ مولانا نے کہا: میں اسے صرف ایک شرط پر قبول کر سکتا ہوں کہ آپ عہد کریں کہ مجھے زندگی بھر آٹا آپ ہی فراہم کریں گے ورنہ میں قبول نہیں کروں گا۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ہمیں تو آٹا اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ وہی عمر بھر دے گا۔ اب اگر آپ زندگی بھر دینے پر آمادہ ہوں تو لے سکتا ہوں۔ ناچار ان صاحب کو آٹے کی بوری واپس لے جانی پڑی۔

اب کچھ مولانا کے طریقۂ تدریس کے بارے میں لکھتا ہوں۔ دراصل مولانا ان اساتذہ میں شامل تھے جو صرف اور صرف کورس کی کتابیں ہی نہیں پڑھاتے بلکہ اپنے شاگردوں کی تربیت اس انداز سے کرتے ہیں کہ علم کے ساتھ ساتھ ان میں عمل کی صلاحیت بھی بیدار ہو اور زندگی کے میدان میں وہ حالات و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ وہ ان اساتذہ میں تھے جو شاگردوں سے قریبی قلبی تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایسی کشش اور جاذبیت تھی کہ مولانا خواہ خوشگوار موڈ میں ہوں یا غصے کی حالت میں، ان کے شاگرد یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہمیں دل سے قریب رکھتے ہیں اور ہمارے خیر خواہ ہیں۔ ویسے مولانا عموماً خوشگوار موڈ میں ہی ہوتے لیکن کبھی کبھار جب غصے کی کیفیت طاری ہوتی تو ان کا جلال پورے عروج پر ہوتا۔ اس کیفیت میں اگر کوئی شاگرد ہتھے چڑھ جاتا تو اس کی خاطر خواہ دھنائی کرتے اور ساتھ ہی زبان سے ایسے الفاظ ادا کرتے جنھیں سننا تو ممکن تھا تحریر کرنا ممکن نہیں۔

راقم الحروف پر مولانا خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں والدۂ مرحومہ کی طبیعت اکثر ناساز رہتی اس لیے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ انھی دنوں ایک روز مولانا نے راقم کو اپنے

پاس بلایا اور پوچھا: راشد، آج تمھاری قمیص میلی کیوں ہے؟ مولانا نے یہ سوال کچھ اس طرح پوچھا کہ راقم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ان سے عرض کیا کہ والدۂ محترمہ کی علالت کی وجہ سے گھر پر کپڑے دھونے والا کوئی نہیں۔ یہ سن کر مولانا نے جو بات کہی وہ آج تک بار بار یاد آتی ہے اور میرا سر ان کے احترام میں جھک جاتا ہے۔ فرمایا: بیٹے والدہ بیمار ہیں تو کیا ہوا، اب تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ اپنا کام خود کر سکو اس لیے اگر کپڑے میلے ہو جائیں تو خود ہی دھو لیا کرو۔ مولانا کے اس نصیحت آمیز جملے نے راقم کے لیے ہمیشہ مشعل راہ کا کام کیا۔

ایک مرتبہ مولانا عربی زبان کی کتاب میں سے حضرت شاہ ولی اللہ کے بارے میں سبق پڑھا رہے تھے۔ سبق عربی میں تھا جس میں ایک مقام پر شاہ ولی اللہ کے قیام حرمین کا ذکر تھا۔ یہاں قیام کے حوالے سے حولین کاملین کے الفاظ بھی آئے جن کے معنی مولانا سبق پڑھتے وقت بتا چکے تھے۔ اب اگلے روز مولانا جب کلاس میں آئے تو سب سے یہی پوچھا کہ حولین کاملین کے کیا معنی ہیں۔ مختلف لڑکوں نے ہاتھ اٹھایا۔ باری باری جب جوابات سنے تو کسی نے کہا اس کے معنی ہیں دو سال بعد، کسی نے دو سال پہلے، کسی نے دو سال تک، کسی نے کہا دو سال۔ مولانا جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے۔ آخر میں ایک نمایاں شاگرد نے ہاتھ اٹھایا۔ مولانا نے فرمایا، تم بتاؤ۔ اس نے کہا، حولین کاملین کے معنی ہیں حرمین شریفین۔ یہ سننا تھا کہ مولانا غور نے اس طالب علم کی طرف دیکھا اور بولے: ماشاء اللہ ماشاء اللہ، حولین کاملین کے معنی حرمین شریفین، اگر ایسے ہی جوابات سننے کو ملے تو جو تھوڑی بہت عربی ہم نے سیکھی ہے اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس کے بعد کلاس کی طرف منہ کر کے بولے تم میں سے زیادہ تر نے حولین کے معنی درست بتائے یعنی دو سال اب رہا کاملین تو ذرا غور کرو اس لفظ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کے معنی کامل یا مکمل کے ہیں یعنی حولین کاملین کے معنی ہوئے کامل دو سال یا مکمل دو سال اور یہی مدت حضرت شاہ ولی اللہ کے قیام حرمین کی ہے۔ یہ ایک مثال تھی مولانا کے طریقۂ تدریس کی جس میں وہ شاگردوں کے ذہن میں سوالات پیدا کرتے اور پھر ان کی رہنمائی کرتے تھے۔

مولانا حافظ قرآن بھی تھے۔ اسلامیات کے پیریڈ میں انبیاء کے قصے بھی شامل تھے اور متعلقہ قرآنی آیات بھی۔ ہر نبی کا قصہ شروع کرنے سے قبل مولانا کافی پہلے سے (عموماً ابتدائے سورۃ سے) تلاوت شروع کرتے اور نہایت خشوع اور خضوع سے کافی دیر تک تلاوت فرماتے پھر مکمل قصہ

بیان فرماتے۔ ایک مرتبہ جماعت میں ایک طالب علم اسلامیات کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس سبق میں کئی بار حضرت عمرو بن العاص کا ذکر موجود تھا۔ طالب علم ان کا نام عمرو ابن العاص پڑھتا۔ اس پر مولانا نے ڈانٹا اور فرمایا یہ کیا عمرو پھمرو پڑھتے ہو۔ صحیح تلفظ عمرو ابن عاص ہے۔

بعض اوقات مولانا باتوں باتوں میں بڑی سبق آموز باتیں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے۔ ایک مرتبہ نصیحتاً فرمایا کہ انسان کو غیر ضروری تکلفات سے دور رہنا چاہیے۔ اس حوالے سے لکھنو کے دونوابوں کا یہ دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک مرتبہ لکھنو کے دونواب ٹرین میں سفر کررہے تھے۔ اتفاق سے دونوں کو بیک وقت قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا جانا پڑا۔ جب دروازے پر پہنچے تو پہلے نواب صاحب کہنے لگے: پہلے آپ۔ اب دوسرے نواب صاحب نے کہا: اجی نہیں پہلے آپ۔ کافی دیر تک تکلفات کی وجہ یہ پہلے آپ پہلے آپ کی تکرار جاری رہی۔ بالآخر پہلے نواب صاحب گویا ہوئے: اجی حضرت اب تو آپ چلے ہی جایئے، میں کب کا فارغ ہوچکا۔ مولانا یہ واقعہ دلچسپ انداز سے اور مکالموں کی ادائیگی بڑے ڈرامائی انداز سے کی۔

مولانا کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کے مظاہرے تقریباً روزانہ ہی سننے اور دیکھنے کو ملتے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے ہم طلبہ بلکہ بعض اساتذہ بھی مولانا سے کسی حد تک گھبراتے تھے کہ کہیں مولانا کا کوئی تیز جملہ سننے کو نہ ملے۔ ایسے ہی ایک واقعے کا گواہ راقم ہے۔ عموماً سردیوں میں تمام اساتذہ صحن میں کرسیاں لگا کر دھوپ میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ راقم نے دیکھا کہ ایک نوجوان استاد حنیف صاحب مولانا کے برابر بیٹھے تھے، وہ پینٹ شرٹ اور پوری آستین کے سویٹر میں ملبوس تھے۔ مولانا سے دوران گفتگو انھوں نے لباس کے حوالے سے نہ جانے کیا جملہ کہا کہ مولانا تیز آواز میں ان سے گویا ہوئے: ارے میاں آپ ہمارے لباس کے بارے میں کیا جانتے ہیں، آپ ہماری جوانی دیکھتے تو اندازہ ہوتا کہ ہم کیسا مہنگا اور نفیس لباس پہنتے تھے، پھر انکے سویٹر کوطرف ہاتھ سے اشارہ کرکے بولے: آپ لوگ تو لنڈے کے کپڑے پہن کر اتراتے پھرتے ہیں، آپ کو کیا علم لباس کس کو کہتے ہیں۔ یہ جملے مولانا غصے کی حالت میں نہیں بلکہ ایک خاص مزاحی انداز سے کہہ رہے تھے جس سے نہ صرف حنیف صاحب بلکہ وہاں بیٹھے تمام اساتذہ دیر تک مسکراتے رہے۔

مولانا کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ان کے پرانے شاگرد بھی ان سے نہ صرف ملنا چاہتے،

ان کی پر لطف گفتگو سننا چاہتے بلکہ ان سے مسلسل تعلق برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ہمیں پڑھا رہے تھے اور ان دنوں علیل تھے کہ دو پرانے شاگرد ملنے آئے۔ ان میں سے ایک صاحب نے شرارتاً مولانا سے اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام یہ ہے اور ان صاحب کا نام یہ ہے اور ہم یہاں صرف آپ کی خیریت معلوم کرنے آئے ہیں۔ مولانا نے جب ان کے منہ تعارف سنا تو ان سے یوں گویا ہوئے: جی نہیں جی نہیں، ہم آپ سے بالکل واقف نہیں اسی لیے آپ اپنا تعارف کرا رہے ہیں۔ ارے ہم آپ کے نام ہی سے نہیں، آپ کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ اس دن پتہ چلا کہ علالت کے باوجود مولانا کی شگفتہ مزاجی کا وہی عالم ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیامندرجہ بالا واقعات اس دور کے ہیں جب راقم علامہ اقبال ہائی اسکول لطیف آباد میں ساتویں اور آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ اندازاً ۷۸-۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ مولانا دو سال ہمیں عربی اور اسلامیات کی تعلیم دے کر دوبارہ زیل پاک اسکول جاچکے تھے لیکن ان کی باتیں اور یادیں تازہ تھیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں راقم نے اسی اسکول سے میٹرک کیا۔ کبھی کبھار مولانا سے لطیف آباد کے مختلف راستوں پر ملاقات ہوجاتی۔ ہمیشہ مولانا بڑی محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے۔ ۱۹۸۴ء میں راقم تمام گھر والوں کے ساتھ حیدرآباد سے کراچی منتقل ہوگیا لیکن حیدرآباد اور لطیف آباد آنا جانا رہتا اور مختلف ذرائع سے مولانا و دیگر اساتذۂ کرام کی خیر عافیت کا علم ہوتا رہا۔ کراچی میں قیام کے دوران مولانا کے حقیقی بڑے بھائی شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی (وفات: ۲۲ر اگست ۱۹۹۹ء بمقام کراچی)، ان کے چھوٹے بھائیوں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی اور مولانا مظفر لطیف صاحب سے روابط بڑھے اور مولانا کی علمیت اور مولانا کے تقویٰ اور پرہیز گاری کے بارے میں علم ہوا۔ ہمارے مولانا نے ساری زندگی بڑی پاکیزگی، بے نفسی اور دنیا سے بے رغبتی سے گزاری۔ وہ مستقل تہجد گزار تھے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد جانا ہوا تو اسکول کے ایک دوست کے ذریعے علم ہوا کہ مولانا مورخہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو لطیف آباد حیدرآباد میں انتقال کر گئے۔ یہ خبر سنتے ہی یوں لگا جیسے ہم کسی قریب ترین بزرگ سے بچھڑ گئے۔ کئی برسوں بعد مولانا کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر عبدالمقیت شاکر علیمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی کتاب 'سبد گل' کا نسخہ پیش کیا۔ اس میں مولانا کے حالات پڑھے تو پتہ چلا کہ مولانا صرف ایک استاد ہی نہیں کئی علوم وفنون کے ماہر تھے۔ وہ بیک وقت ایک ماہر

تیراک، فن پہلوانی کے ماہر، لکڑی چلانا یعنی بنوٹ کے ماہر، نگینہ سازی کے ماہر، فن خطاطی کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ کبوتر بازی کے ماہر بھی تھے۔ مولانا کے خود نوشتہ مختصر حالات زندگی ڈاکٹر فیوض الرحمٰن صاحب کی مرتبہ کتاب 'علماء کی کہانی خود ان کی زبانی' میں بھی موجود ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا، ہم یہاں مولانا کے مختصر حالات زندگی اور علمی خدمات پر روشنی ڈالیں گے:

مولانا ابو العلاء عبدالعلیم ندوی صاحب مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو جیپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم عبدالرحیم خاطر اس دور کے نامور خوش نویس، فارسی و اردو کے شاعر اور مطبع رحیمی کے مالک تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم والد ماجد اور تایا حافظ عبدالکریم صاحب سے حاصل کی پھر مدرسہ تعلیم الاسلام جیپور میں فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ دارالعلوم ڈابھیل (سورت) میں تعلیم حاصل کی پھر برصغیر کے معروف تعلیمی ادارے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں داخل ہوگئے۔ یہاں اس زمانے میں بڑے ممتاز اساتذہ موجود تھے جن سے مولانا نے بھرپور استفادہ کیا۔ ان اساتذہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا اویس ندوی، مولانا محمد شبلی ندوی، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام اساتذہ میں جس استاد سے مولانا نے سب سے زیادہ استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ شب و روز ان کی خدمت میں رہ کر وہ کتب بھی پڑھیں جو نصاب میں شامل نہیں تھیں وہ شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا نے ۱۹۳۸ء میں سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا ساتھ ہی مولانا احمد علی لاہوری سے تفسیر قرآن کا درس بھی لیا۔ ۱۹۴۱ء میں مولانا حیدرآباد دکن تشریف لے گئے جہاں مولانا محمود حسن ٹونکی صاحب کی معاونت کی جو ایک عظیم علمی منصوبے یعنی 'معجم المصنفین' کی تکمیل میں مصروف تھے۔

مولانا عبدالعلیم ندوی صاحب کی تالیفات و تراجم درج ذیل ہیں:

۱۔ علامہ ابن جزری کی معروف کتاب حصن حصین کا ترجمہ اور شرح

۲۔ شیخ شرف الدین النووی کی اربعین کی شرح

۳۔ دعا کی حقیقت

۴۔فضائل درود پر رسالہ

۵۔مولانا حیدر حسن خان کے رسالے 'التعامل' کا اردو ترجمہ

۶۔سندھ کے مشہور عالم مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی کتب 'فرائض الاسلام'، 'کشف الرین' اور 'تنقیح الکلام فی مسئلۃ قراۃ خلف الامام' کو کئی کتب کی مدد سے بڑی تحقیق سے مرتب کیا اور ان کا ترجمہ وتشریح کی۔

مولانا سے تلمذ کو ۳۵ برس اور ان کے انتقال کو ۲۵ برس ہو چکے ہیں لیکن ان کی شفقت، محبت، جذبۂ خیر خواہی، بذلہ سنجی اور علمیت کے واقعات بار بار یاد آتے ہیں۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو ان کا نصیحت آمیز جملہ بے اختیار یاد آجاتا ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا۔ دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش مولانا زندہ ہوتے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے عرض کرتا کہ آپ نے برسوں پہلے مجھے اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی نصیحت کی تھی۔ اس کے بعد میں نے بہت سے کام اپنے ہاتھوں سے کرنا سیکھے اور اب بھی سیکھ رہا ہوں لیکن میں نہ پہلے تھا نہ اب بڑا ہوں بلکہ بڑے تو حقیقت میں آپ ہیں کہ آپ کے ایک جملے نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ ساتھ ہی مولانا کی جب بھی یاد آتی ہے تو یہ نہ بھولنے والا شعر بھی یاد آتا ہے:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں